شرابِ کہن پھر پلا ساقیا

تحریر: حامد سجاد طاہر*

آج اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جہاں مغربی افکار اور نظریات کی بالادستی قائم نہ ہو۔ یوں تو آج دینِ توحید کے نام لیواؤں کی تعداد ڈیڑھ ارب کے عدد کو عبور کر چکی ہے اور پچپن سے زائد ممالک میں وہ اکثریت میں ہیں مگر اس سب کے باوجود آج روئے زمین پر کوئی ایک بھی ایسا ملک نظر نہیں آتا جسے ہم دنیا کے سامنے ایک ماڈرن اسلامی ریاست کے ماڈل کے طور پر پیش کر سکیں۔ فکری سطح پر بھی دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ آج اسلام کا دامن علم و حکمت کے آبگینوں سے خالی ہے اور وہی حکمت جو کبھی مؤمن کی میراث کہلاتی تھی آج غیروں کے گھر کی کنیز ہے۔ یہاں دانشور وہ ہے جس نے اپنی فکر کو نسیم مغرب سے سینچ رکھا ہو اور مہذب کہلانے کا حق دار وہ ہے جو مغربی اطوار کی نقالی پر فخر کرتا نظر آئے۔ اور حد تو یہ ہے کہ وہ تحریکیں جو بزعم خود مغرب کی مخالف ہیں' خود بھی بڑی حد تک مغرب سے مستعار شدہ خیالات کی حامل ہیں۔ آخر یہ سب کیوں ہے؟ قرونِ اُولیٰ کے مسلمان اور آج کے مسلمان میں فرق و تفاوت کی خلیج کیوں حائل ہو گئی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہمارے صدر صاحب ہوں یا کوئی راہ چلتا آدمی سب ہی اسلام کے گن گاتے نظر آتے ہیں' مگر پھر بھی مساجد ہیں تو نمازیوں سے خالی ہیں' مدارس ہیں تو ان پر خاک اڑ رہی ہے۔ وہ دانشور حضرات جو اغیار کا قصہ جب چھیڑتے ہیں تو زبان تسنیم و سلسبیل سے دھلی معلوم ہوتی ہے مگر جب بھی بیچارے اسلام کی باری آتی ہے تو ان کے افکار برق گراتے معلوم ہوتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اور پھر اس سب کا علاج کیا ہے؟ یا بالفاظِ دیگر موجودہ حالات میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے کرنے کا

☆متعلم ایف اے (سال اول) قرآن کالج لاہور

اصل کام کیا ہے؟

میں آنے والے صفحات میں کوشش کروں گا کہ ان سب سوالات کے تسلی بخش جوابات دے سکوں۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ آج اس ساری بحث کو چھیڑنے کا میرا اصل مقصد کیا ہے۔ میرے اصل مخاطبین طلبۂ قرآن کالج ہیں اور ع ''ارادہ ہے کہ ان کا دل پھر اِک بار گرماؤں'' کے مصداق میں انہیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا چاہتا ہوں' تاکہ شاید اِن میں سے کوئی شخص پھر سے عزم و حوصلہ لے کر اٹھے اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کرے جسے دورِ زوال میں وقتاً فوقتاً اُمت میں سے بہت سے افراد نے دیکھا ہے اور جس کے لئے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا جسے آج ہم قرآن کالج کے نام سے جانتے ہیں۔ بہرحال میں نے ایسے طلبہ کے لئے جو اسلام کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں' رہنمائی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو سقراط یا بقراط تصور کرتا ہوں' بلکہ میں تو خود بھی ہدایت کا طالب ہوں' لیکن اس کے باوجود جو کچھ جانتا اور سمجھتا ہوں اسے آگے پہنچانے کو اپنا فرض جانتا ہوں اور یہ بھی کہ اس تحریر کا اصل مقصد ایک جذبہ پیدا کرنا ہے اور جذبہ اگر ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو عمل کا روپ دھارنے کے لئے راہیں خود متعین کر لیتا ہے۔ تاہم میں نے ان کے سامنے مثال رکھنے کے لئے ان شخصیات اور تحاریک کا تذکرہ بھی کیا ہے جو اس ضمن میں اپنی کاوشیں صرف کر چکے ہیں' تاہم ان کی یہ کاوشیں بتقاضائے بشریت غلطیوں سے مبرا نہ تھیں۔ انہیں یہاں بیان کرنے کا مقصد ہرگز ہرگز ان کا مذاق اڑانا نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ ہم ان سے سبق حاصل کریں اور خود اِن غلطیوں سے بچ سکیں۔

یہ واضح کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس مضمون میں میرا اپنا حصہ محض چند کتب کے مواد کو جمع کر کے ترتیب دینا ہے۔ میں نے آخر میں ان کتب کی تفصیل بھی درج کر دی ہے تاکہ جن حضرات کو مزید تفصیل درکار ہو وہ اِن کتب کی طرف رجوع کر لیں۔

———☆———

اس سے پہلے کہ میں موضوع کو زیر بحث لاؤں' میں ایک اصطلاح کی وضاحت کرنا چاہوں گا جسے میں نے اوپر استعمال کیا ہے۔ وہ اصطلاح ہے ''نشاۃِ ثانیہ''۔ اس کا لغوی مفہوم ہے ''دوسری بار اٹھانا یا عروج پانا''۔ اس اصطلاح کی روشنی میں اگر ہم تاریخ اسلام کا جائزہ لیں تو بظاہر یہ غلط معلوم ہوتی ہے' کیونکہ مادی یا عسکری سطح پر اسلام کو یعنی اُمتِ مسلمہ کو دو ہی عروج اور دو ہی زوال نصیب ہوئے ہیں' جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) پہلا عروج

اسلام کو سیاسی سطح پر عروج حضور پاک ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی ملنا شروع ہو گیا تھا' مگر اس کی صحیح معنوں میں ابتدا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوئی اور اُمیین (عرب) نے اسلام کے جھنڈے کو ایک طرف فرانس کے قلب میں جا گاڑا تو دوسری طرف ایشیائے کوچک میں بھی نصب کر دیا۔ یہ دَور فی الواقع آغاز ہی میں ع ''رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا'' کا نقشہ پیش کر رہا تھا' مگر پھر معمولی اونچ نیچ کا شکار رہنے کے بعد اُمت مسلمہ روبہ زوال ہو گئی۔

(۲) پہلا زوال

خلافت عباسیہ کے دوران ہی اُمت کی وحدت ختم ہو گئی تھی اور یہ بغداد میں عباسی' قاہرہ میں فاطمی اور قرطبہ میں اُموی خلافتوں میں بٹ گئی تھی جس نے طاقت کو نقصان پہنچایا اور باقی رہی سہی کسر مغرب سے صلیبی فوجوں اور شمال سے منگولوں اور تاتاریوں کے حملوں نے پوری کر دی۔ صلیبیوں نے بیت المقدس کی عظمت کو بٹہ لگایا لیکن پھر بھی اُمیین کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور اسے بازیافت کرایا تو بھی آخرین (غیر عرب) میں سے ایک نوجوان صلاح الدین ایوبی نے' تاہم وہ بھی کوئی پائیدار قوت فراہم نہ کر سکا اور تاتاریوں نے بغداد کے الف لیلوی شہر کی داستانوں کو رہتی دنیا تک عبرت کا سامان بنا کر رکھ دیا۔

(۳) دوسرا عروج

اس کے بعد اللہ کی رحمت نے جوش مارا اور وہی تاتاری جنہوں نے عالم اسلام کو

تباہیوں سے دوچار کیا تھا' اسلام لے آئے۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ان کا ایک حصہ ہند میں مغلوں کی صورت میں قابض ہوا تو ان ہی میں سے ایک معمولی جاگیردار عثمان نے خلافت عثمانیہ کی بنا ڈالی ع کہ جس کی تیغ ہیبت ناک سے سفاک ڈرتے تھے! اور جو اپنے عروج کے زمانے میں تین براعظموں پر محیط تھی۔

(۴) دوسرا زوال

مگر پھر ''ہر کمالے را زوالے'' کے عالمگیر اصول کا شکار ہو کر اسے بھی کچھ اپنوں کی سادگی اور کچھ غیروں کی عیاری نے تباہ و برباد کر دیا اور وہ قبائے خلافت کہ جس کے بغیر کوئی مسلمان جینے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا' تار تار ہو گئی۔ تقریباً سارا عالم اسلام یورپی استعمار کے زیر سایہ آ گیا اور بعد میں جب انہوں نے برائے نام آزادی حاصل کر بھی لی تو قبلہ یا تو واشنگٹن کو بنایا یا ماسکو کو اور صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی طرف توجہ نہ دی' لہٰذا یہ زوال تا حال جاری و ساری ہے۔

☆

اوپر کی بحث سے بظاہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اصطلاح غلط ہے اور ہمیں نشاۃِ ثانیہ کی جگہ نشاۃِ ثالثہ کی اصطلاح استعمال کرنی چاہئے تھی' مگر دراصل یہاں جو عروج و زوال مراد ہے وہ عسکری نہیں بلکہ فکری ہے' یا بالفاظِ دیگر اُمت مسلمہ کی ہی نہیں بلکہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہے۔ اور جہاں تک اس کا تعلق ہے تو اس ضمن میں زوال کا آغاز خلافتِ عباسیہ کے دَور میں یا انیسویں صدی میں نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا آغاز تو خلافت راشدہ کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا جب آہستہ آہستہ اسلامی ریاست میں حکمران' علماء اور صوفیاء کی تثلیث قائم ہو گئی تھی۔ حکمرانوں نے تو قرآن سے کوئی ربط نہ رکھا سوائے اس کے کہ ضرورت پڑنے پر اس کے ذریعے جہاد کے وعظ دلوا کر سرحدوں میں توسیع کا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ علماء نے بھی اس سے فقہی مسائل دریافت کر کے

اسے پسِ پشت پھینک دیا اور ان کے نزدیک اس کی حیثیت کتاب الفقہ یا یکے از ادلہ اربعہ (چار میں سے ایک) سے زیادہ نہ رہی۔ رہا معاملہ صوفیاء کا تو انہوں نے یوں تو ہر آیت کے ظاہر میں ستر ستر باطن نکالنے کا دعویٰ کیا مگر عملاً باطن تو کیا ظاہر سے بھی دلچسپی نہ دکھائی اور قرآن کی اہمیت قرونِ اُولیٰ کے بعد ہی تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ نتیجتاً توجہات ایمان سے ہٹ کر اسلام' یقین سے ہٹ کر شہادت اور باطن سے ہٹ کے ظاہر پر مرتکز ہو گئیں جس کی بدولت ایک فکری خلا سا پیدا ہو گیا جسے فلسفۂ یونان نے آ کر بھر دیا اور نقل سے تعلق توڑ کر عقل کے علَم بلند ہونے لگے' جس کی ابتداء جبریہ اور قدریہ کے باہم مباحث سے ہوئی تھی' اسے اشاعرہ اور معتزلہ کے باہم مناظروں نے منطقی نتیجے تک پہنچا دیا۔ آیاتِ محکمات کو چھوڑ کر آیاتِ متشابہات پر مورچے باندھ دیئے گئے اور ان پر ہونے والے مناظروں نے یہ حالت اختیار کر لی کہ بغداد کے بیچ چوراہوں میں علماء کے بڑے بڑے گروہ سوئی کی نوک پر (معاذ اللہ) فرشتے بٹھانے میں مصروف تھے کہ تاتاریوں نے ان کی روحوں کو ہی فرشتوں کے حوالے کر دیا۔ زوالِ علم و عرفان کی یہ داستان یوں تو بڑی طویل ہے مگر علامہ اقبال نے اسے ایک ہی شعر میں یوں سمو دیا ہے ۔

تمدن ' تصوف ' شریعت ' کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!

(۱) تمدن

وہ قوم جس کے بانی ﷺ کے جسم اطہر پر بان کی چٹائیوں کے نشان بنے ہوتے تھے' الحمراء کے محلوں کی تعمیر میں مصروف ہو گئی۔ محلات کی اونچائی بڑھتی چلی گئی جبکہ ایمان پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ مسجدوں کو بنانے میں نمازیوں سے زیادہ کاریگر لگ گئے۔ مدرسوں کی تعمیر خون علم کی جگہ اینٹ گارے سے ڈالی جانے لگی۔ بغداد کا شہر یورپ کے قریوں کا منظر تو پیش کرنے لگا مگر تاتاریوں کے آگے ڈھال بننے میں ناکام رہا۔ شعراء کو ملک الشعراء کا خطاب تو ضرور مل گیا مگر وہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے میں

ناکام رہے۔ شمشیروں کی جگہ شعروں' ڈھالوں کی جگہ ڈھولوں اور نیزوں کی جگہ باجوں نے لے لی۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل' طاؤس و رباب آخر!

(۲) تصوف

اس خیال سے تو اختلاف ممکن ہے کہ تصوف کی ابتداء ہی غلط اصولوں پر ہوئی تھی' تاہم اس امر میں اتفاق کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کی موجودہ حالت اسلام کے اصولوں سے سراسر متصادم ہے۔ کچھ کے نزدیک اس کی ابتداء تو درست تھی مگر پھر بعد میں ہندوستانی' ایرانی' عیسائی اور دیگر فلسفوں کی آمیزش سے یہ تالابِ اطہر بدبودار جوہڑ میں تبدیل ہوگیا جبکہ بعض کے نزدیک اس عمارت کی بنیاد ہی غلط نہج پر اٹھی تھی۔

بہرحال تصوف میں نظریۂ وحدت الوجود کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ میں اس نظریئے کے متعلق اپنے یا کسی اور کے خیالات کی جگہ اقبال کے تصورات کو نقل کرنا پسند کروں گا جو اگرچہ اس معاملے میں ہرگز کوئی اتھارٹی نہیں ہیں لیکن بہرحال ان کے بعض اشعار کو یہ طبقہ بڑے دھڑلے سے استعمال کرتا ہے اور عرس ہو یا میلہ ہر جگہ ان ہی کی غزلیں بصورت قوالی سننے کو ملتی ہیں۔ اقبال کے خیال میں جزو سے کل تک پہنچنے کا یہ وحدت الوجودی فلسفہ خالصتاً ہندوستانی ہے جسے سب سے پہلے ایک ہندوستانی مفکر سری شنکر نے پیش کیا تھا اور اس نقطۂ نظر سے گیتا کی تفسیر کی تھی۔ بعد میں مسلمانوں میں سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے اسی نقطۂ نظر سے قرآن کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا اور رفتہ رفتہ مسلم مفکرین بھی اسی رنگ میں رنگیں ہوتے گئے اور پھر شاعروں اور بالخصوص ایرانی شعراء نے اس کا پرچار کیا اور جزو سے کل تک کا درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے ''رگِ چراغ'' میں ''خونِ آفتاب'' کا اور ''شرارِ سنگ'' میں ''جلوۂ طور'' کا مشاہدہ کر ڈالا۔ علاوہ ازیں صوفیاء نے ہی مسلمانوں میں ''قدمِ ارواح'' اور ''مسئلہ تنزلاتِ ستہ'' کو متعارف کرایا۔ ان

میں سے قدم ارواح دراصل افلاطونی نظریہ ہے اور اسی کی وجہ سے امام غزالی نے بوعلی سینا اور ابونصر فارابی کی تکفیر کی تھی۔ شیخ ابن عربی نے اس فلسفے میں محض اتنی تبدیلی کی کہ اسے صالحین و کاملین کی ارواح کے ساتھ خاص کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ اصول وہی ہے اور اسی نظریئے نے مسلمانوں میں قبر پرستی کی بنا ڈالی۔ دوسری طرف ''تنزلات ستہ'' کا فلسفہ افلاطونیت جدیدہ کے بانی ''پلوٹائنیس'' کا تجویز کردہ ہے اور وحدت الوجود دراصل اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔

عربی لٹریچر تو ان زہروں سے بقول اقبال محفوظ ہی رہا تاہم فارسی لٹریچر کو اس نے بری طرح پراگندہ کر ڈالا جس کی سب سے نمایاں مثال حافظ شیراز کا کلام ہے جس کے اثر بد کے متعلق اکبرالہ آبادی جیسے صوفی شاعر کو بھی یہ کہنا پڑ گیا تھا۔

ان میں باقی ہے کہاں خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

چنانچہ اسی تصوف اور اسی صوفیانہ کلام کی بدولت عوام کے قویٰ مضمحل ہو گئے اور وہ بھی ظاہر پر باطن کو، شریعت پر طریقت کو اور ہوش پر سکر کو ترجیح دینے لگے۔ اور اس سب کا اثر ان کے اعمال پر کیا ہوا اس کا کچھ اندازہ تو اکبر کے درج بالا شعر سے ہی ہو جاتا ہے، مگر اسے مزید واضح کرنے کے لئے ایک اور مثال مناسب رہے گی۔ وحید خان ایک شاعر تھا جو کسی جوگی کا مرید ہو کر ویدانیت (ویدانیت، ہمہ اوست اور وحدت الوجود ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں) کا قائل ہو گیا۔ اس تبدیلیٔ خیال و عقیدہ نے اس پر جو اثر کیا اسے وہ خود بیان کرتا ہے۔

تھے ہم پوت پٹھان کے دَل کے دَل دیں موڑ
چرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے مُنہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگناتھ جی کے پیر پکڑے ہیں، یا بالفاظِ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے، میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا، کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہے۔

مزید برآں یہی فلسفہ کارفرما ہے رہبانیت کے پیچھے اور اس مقولے ''دنیا ہیچ است وکارِ دنیا ہمہ ہیچ'' کے پیچھے۔ یہ بھی اسلام کی فکری تعلیم کے متصادم ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ''ترک الاسباب جهالة والاعتماد عليها شرک ''یعنی ''اسبابِ دنیا کوترک کرنا جہالت ہے جبکہ ان پر اعتماد کرنا شرک ہے''۔

(۳) فقہ

فقہ کے متعلق بالعموم کہا جاتا ہے کہ یہ دورِ ملوکیت میں مدون ہوئی۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے' لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کا مقصد تدوین ہی دراصل ملوکیت کا تحفظ تھا یا اس پر ملوکیت نے نہایت گہرے اثرات چھوڑے ہیں بڑی غیر منطقی زقند ہے جسے کوئی باشعور فرد سراہ نہیں سکتا۔ یہ قول دراصل مرعوبانہ ذہنیت کی پیداوار ہے اور اس کا مقصد یہی ہے کہ شریعت کو مغربی اصولوں کے تحت از سرِ نو مدون کیا جائے اور اس کے لئے اجتہاد کے لفظ کو یہ جانے بغیر کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے' نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پھر ایسے افراد جو یہ دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے خود تو شاید ہی کبھی فقہ کی کوئی کتاب دیکھی ہوتی ہے یا شاذ ہی انہیں اس علم سے کوئی خاص آگاہی ہوتی ہے' اِلا ماشاء اللہ' ان کا علم بالعموم سنی سنائی باتوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ دلائل کے طور پر چند ایسے بادشاہوں اور امیروں کے طرزِ عمل کو پیش کرتے ہیں جنہیں شریعت سے کوئی علاقہ نہ تھا یا پھر انتہائی دردناک مثالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اسلام کے معاشی نظام کو پوری طرح سمجھے بغیر سودی نظام کی حمایت میں چند فرضی بیواؤں' یتیموں اور بوڑھوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے متعلق تو یہی عرض کیا جاسکتا ہے ع

دعوائے بے دلیل قبولِ خرد نہیں!

مزید برآں اس بات میں ہرگز کوئی حرج نہیں کہ شریعت کی حکمتوں کو عقل وخرد کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جائے' بلکہ یہ انتہائی مفید کام ہے کہ اس طرح ان احکام کو بجا لانے والے کو بھی انشراحِ صدر حاصل ہوتا ہے اور مخالفین کے دلائل کا توڑ بھی اس سے

کیا جا سکتا ہے' مگر عقل کو معیار بنا کر شریعت کو اِس پر پرکھنا اور اس کے مطابق کانٹ چھانٹ کرنا دراصل شریعت خداوندی کو شریعت عقلی میں تبدیل کرنا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اقبال کو بھی کہنا پڑ گیا تھا۔

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں!

(۴) کلام

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی متکلم عضد الدین ایجی نے علم الکلام کی تعریف کچھ یوں کی تھی:

''علم الکلام وہ علم ہے جو عقائد دینی کو مستحکم طور پر ثابت کرنے کے لئے دلائل دینے اور شبہات کا ازالہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے''۔

مسلمانوں میں علم کلام کا آغاز دراصل بعض اعتقادات کی عقلی و منطقی توجیہہ و تشریح سے ہوا تھا' لیکن بعض افراد بیرونی اثرات مثلاً فلسفۂ یونان وغیرہ کے زیر اثر آ کر اسلامی عقائد کو عقل کی کسوٹی پر ناپتے ناپتے اتنی دُور نکل گئے کہ علمائے شریعت کو اُن کی تکفیر کرنی پڑی۔ اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار آیاتِ متشابہات تھیں جن کی من مانی تاویل کر کے اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ قرآن میں اصل حیثیت آیاتِ محکمات کو حاصل ہے اور قرآن خود انہیں اُمّ الکتاب کا نام دیتا ہے' لہٰذا متشابہات کی ہر وہ تشریح جو محکمات اور صحیح احادیث کے خلاف ہو قابل قبول نہیں۔ ورنہ ہماری فکر میں کجی پیدا ہو جائے گی اور ہم ایک گرہ کو کھولنے کے بعد سو گرہوں کا شکار ہو جائیں گے اور حقیقت تک ہماری رسائی ناممکن ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے علمائے تفسیر نے حتی الوسع قرآن کے لفظی مطلب سے قریب ترین رہنے کی تلقین کی ہے لیکن بدقسمتی سے بعض ایسے افراد جو بزعم خود تجدید اسلام کا ارادہ لے کر نکلے تھے ان سے اسی غلطی کا ارتکاب ہوا کہ انہوں نے محکمات کے ذریعے متشابہات کی تشریح و توضیح کرنے کے بجائے متشابہات کے ذریعے محکمات کی تاویل کرنی شروع کر دی۔ اور پھر یہ تاویل بھی بالعموم

افکارِ اغیار سے متاثر ہو کر کی گئی اور اس کے ذریعے وہ نقل کو عقل کے ہر تقاضے کے سامنے سرنگوں کرتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر قرآن میں بعض جگہ جہنم کی آگ کا دلوں تک پہنچ جانے کا تذکرہ ہے تو یہاں دل کو روح کا استعارہ مان کر یہ نتیجہ نکالا گیا کہ حساب اور جزا و سزا کا معاملہ اجساد کے ساتھ نہیں بلکہ ارواح کے ساتھ ہوگا اور پھر اسی کے ذیل میں ان تمام آیات جن میں یوم الدین اور جنت و دوزخ کا ذکر ہے' کی تاویل کر کے اسلام کو ایک فلسفیانہ مذہب میں تبدیل کر کے رکھ دیا گیا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

نوٹ : یہاں میں نے درج بالا چار علوم کے صرف منفی پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ چاروں علوم گندگی کا ڈھیر ہیں' بلکہ یہاں صرف ان قابل مذمت مساعی پر تنقید کرنا مقصود ہے جو ان علوم کو آڑ بنا کر کی گئی ہیں۔

☆

یہ تو تھیں چند ابتدائی باتیں۔ اب ہم تاریخی اعتبار سے اس فکری زوال کے عوامل اور ان کے ردعمل کے طور پر ابھرنے والی اہم شخصیات' تحاریک اور اس ضمن میں ہونے والے اہم واقعات کا تذکرہ کریں گے۔

قبل از غزالی دَور

مسلمانوں میں عقائد دینی کو عقلی معیار پر پرکھنے کا کام ذرا بعد میں شروع ہوا۔ ابتداء میں جو علم الٰہیات کی تشکیل ہوئی وہ دراصل بعض مابعد الطبیعیاتی مسائل پر آپس میں مباحث پر مبنی تھی اور اس میں اصل اہمیت عقل کے بجائے نقل کو ہی حاصل رہی' چنانچہ جبریہ ہو یا قدریہ' مرجئہ ہو یا وعیدیہ' انہوں نے جن موضوعات کو نشانۂ بحث بنایا دلیل کے طور پر نقل کو ہی پیش کیا اور عقل کو محض اس کی وضاحت و تشریح کے لئے استعمال کیا گیا۔ تاہم مسلم تاریخ میں معتزلہ غالباً وہ پہلا گروہ ہے جس نے نقل کو عقل کے معیار پر پرکھنے کی طرح ڈالی اور عقل و منطق کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی اور ان تصورات کو

جوان کے نقطۂ نظر کے مطابق منطقی تصویب کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے' نئے معانی پہنا کر عقل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا انہوں نے ملائکہ' جنت' دوزخ' پل صراط' میثاق' میزان' کوثر' معراج' معجزات' عذابِ قبر اور اس طرح کی دیگر اصطلاحات کو اِن کے معروف معنوں میں لینے سے انکار کیا۔ ان کی بنیادی بحثیں صفاتِ خداوندی سے ذاتِ خداوندی کا تعلق' رؤیت باری تعالیٰ' خلق قرآن کا مسئلہ' عدل الٰہی اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حقیقت پر مشتمل تھیں۔ اس ضمن میں انہوں نے نقل سے بھی حوالے دیئے مگر بنیادی طور پر استدلال عقل وخرد سے ہی کیا۔ چونکہ انہیں ایک وقت میں حکومت وقت سے قرب بھی حاصل رہا لہٰذا انہوں نے اپنے مخالفین بالخصوص مسئلہ خلق قرآن میں اپنے نکتہ چینوں پر ظلم وتشدد کا بازار گرم کیا۔ اس ضمن میں جس ہستی کا نام سرفہرست ہے وہ امام احمد بن حنبلؒ ہیں جنہوں نے شدید ظلم سہہ کر بھی حق کا جھنڈا بلند ہی رکھا۔

معتزلہ کے ردعمل کے طور پر اشاعرہ ابھرے۔ اس گروہ کے بانی جناب ابوالحسن الاشعریؒ تھے جو شروع میں تو معتزلہ کے حامی تھے مگر بعد میں انہوں نے اعتزال سے توبہ کی اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ اشاعرہ کے مطابق عقل انسانی محدود ہے وہ تمام حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتی لہٰذا اصل حقیقت ایمان بالغیب کی ہے۔ اشاعرہ نے بیک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑی۔ ایک طرف تو انہوں نے معتزلہ کے عقائد ونظریات کے معاملے میں قرآن وحدیث میں بیان کردہ عقیدوں کی مدافعت کی۔ دوسری طرف روایت پرستوں کے اس نقطۂ نظر کی بھی مخالفت کی کہ مذہبی معاملات میں عقل کو بالکل ہی استعمال نہ کیا جائے۔ ان کی امتیازی شان یہ ہے کہ انہوں نے نقل کو عقل پر ترجیح دی اور اسے عقل کی صحت کو ناپنے کا معیار قرار دیا۔ انہوں نے معتزلہ کے برخلاف درج ذیل نظریات پیش کئے:

۱) صفاتِ باری تعالیٰ نہ تو ذاتِ باری تعالیٰ کا حصہ ہیں نہ ہی اس سے جدا ہیں' بلکہ اس کا تعین کرنا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔

۲) قرآن مجید فرقان حمید غیر مخلوق اور قدیم ہے۔
۳) رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے۔
۴) آزادیٔ ارادہ دراصل شعورِ آزادیٔ ارادہ تک محدود ہے اور اخلاقی اعمال کے ماسوا باقی تمام اعمال میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پیہم فعالیت کارفرما ہے۔

مسلمانوں کی ان باہم بحثوں کے دوران ہی ان پر فلسفۂ یونان کی یلغار شروع ہو گئی تھی۔ ۷۶۲ء میں پہلے عباسی خلیفہ المنصور نے بغداد کی بنیاد رکھی تو اس نے دُور دراز کے علاقوں سے علماء وحکماء کو اس شہر میں بلایا اور مختلف علوم وفنون کی کتب کا ترجمہ شروع کروایا۔ تاہم اس فکری بوچھاڑ کا بھرپور آغاز خلیفہ مامون الرشید کے دَور میں ہوا۔ کہا جاتا ہے (اور جیسا کہ ''الفہرست'' میں ہے) کہ مامون نے خواب میں ارسطو کا دیدار کیا اور وہ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے شاہِ روم سے (جاگنے کے بعد) دوستانہ تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے مراسلت کے ذریعے قدیم علوم کے ذخیروں اور نادر کتب کے نسخوں کا کچھ حصہ بغداد بھیجنے کی درخواست کی۔ روم میں پہلے ہی ۵۲۹ء سے ان علوم کی تحصیل پر کلیسا نے پابندیاں عائد کر رکھی تھیں اور قدیم کتب کی لائبریریوں کو تالے لگا دیئے گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بڑی خوشی سے اس بات کی اجازت دے دی۔ چنانچہ مامون نے بعض علماء کو بھیج کر کتب وغیرہ منگوالیں اور ۸۳۲ء میں بغداد میں ایک بیت الحکمت قائم کیا اور اس کے ساتھ ایک رصدگاہ' ایک لائبریری اور ایک دارالترجمہ بھی منسلک کیا۔ علم وفضل کا یہ مرکز تیسری صدی قبل مسیح میں بننے والی اسکندریہ یونیورسٹی کے بعد دنیا میں سب سے بڑا مرکز تھا۔ فلسفۂ یونان کی اس آمد سے مسلمانوں کا تقریباً ہر علم متاثر ہوا۔ تاہم تصوف اور علم الکلام اس ضمن میں سب سے زیادہ اثر پذیر ہوئے۔ مزید برآں اسی کے زیر اثر مسلمان مفکرین کا ایک اور گروہ بھی اٹھا جو عقلیت پسندوں پر مشتمل تھا جو کہ مسلم تاریخ میں فلاسفہ کہلانے کے اصل حق دار تھے۔ یہ سب کے سب فلاسفہ دیگر علوم مادیہ مثلاً سائنس کے بھی ماہر تھے۔ بلکہ اگر بدقتِ نظر دیکھا جائے تو فلسفے میں تو ان کا کردار بیشتر ترجمے کا اور اتباع کا ہی نظر آتا ہے'

تاہم انہوں نے سائنس کے میدانوں میں بیش قدر اضافہ کیا۔ ان میں سے قابل ذکر نام الکندی، فارابی، ابن سینا، ابن الہیثم، ابن مسکویہ وغیرہ کے ہیں۔

امام غزالیؒ

حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الطوسی الشافعی الغزالی ۱۰۵۸ء میں خراسان کے علاقہ طوس میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک غریب کسان کا بیٹا ہونے کے باوجود علم و فضل میں کمال پیدا کیا۔ تاہم پھر آپ بتدریج تشکیک کا شکار ہوتے چلے گئے اور انہی علوم کے بارے میں جن کے آپ معلم تھے، ریب میں مبتلا ہو گئے کہ کیا واقعی عقل و منطق سے مابعد الطبیعی تصورات کا ادراک ممکن ہے؟ گیارہ سال کی صحرانوردی کے بعد انہیں تصوف کے ذریعے یقین کا وہ سرمایہ نصیب ہوا جو فلسفیانہ اور دیگر علوم کا مطالعہ عطا نہ کر سکا تھا۔ آپ کا انتقال ۱۱۱۱ء میں ہوا۔

امام غزالیؒ نے مسلم فکر و فلسفہ پر سب سے گہرے اثرات چھوڑے۔ ان کا اصل کارنامہ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''تہافتہ الفلاسفہ'' (فلاسفہ کا ابطال) ہے۔ دراصل آپ کے پیش نظر چار قسم کے گروہ تھے، متکلمین، صوفیاء، باطنیہ اور فلاسفہ۔ آپ نے ان چاروں کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ان سب پر مختلف کتابیں لکھیں اور ان سب کا محاکمہ کیا۔ لیکن سب سے زیادہ زور آپ نے فلاسفہ کے ابطال پر دیا۔ فلاسفہ کے نزدیک عقل کو نقل پر فوقیت حاصل تھی جبکہ آپ عقل کی نارسائی سے آگاہ تھے۔ آپ نے فلاسفہ کو ان کے خدا کے متعلق تصورات کی بنیاد پر تین حصوں میں تقسیم کیا۔

۱) دہریئے (Atheists) یا ملحدین جو خدا کے کسی بھی تصور کے منکر تھے اور کائنات کی ازلیت کے قائل تھے۔

۲) طبعیین یا الاہ پرست (Deists) جو ہستیٔ باری تعالیٰ کے تو قائل تھے مگر اس نظریئے کے پرچارک تھے کہ اس نظام ہست و کون کو ایک بار تو ''غیر متحرک محرک'' (un-moved mover) نے چلا دیا تھا مگر تب سے یہ علت و معلول کے لگے بندھے اصولوں کے تحت چل رہا ہے اور مشیت ایزدی کا اب اس میں کوئی

کردار نہیں۔

۳) الوہیت پرست (Theists) جو خدا کو کائنات کا خالق و مالک تسلیم کرتے تھے اور ساتھ ہی اس کے کائنات کے ساتھ مستقل تعلق کے قائل بھی تھے' لیکن مختلف منطقی الجھنوں کا شکار ہو کر ان کا فکر و فلسفہ تضادات کا شکار تھا' بالخصوص فارابی اور ابن سینا تو اپنے نظریات میں متعدد مغالطوں کا شکار تھے۔

امام غزالیؒ نے سب سے زیادہ تیسرے گروہ کو ہدف تنقید بنایا اور آپ نے سب سے پہلے ایک کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' کے عنوان کے تحت لکھی اور اس میں فلاسفہ کے مختلف نظریات مع دلائل بالصراحت درج کئے تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اور پھر ''تہافۃ الفلاسفہ'' میں فلاسفہ کے بیس بنیادی نظریات کا انتخاب کر کے ان پر جرح کی اور پھر ان کی غلطی خود انہی کے منطقی اسلوب سے واضح کی۔ مزید برآں آپ نے مسلم فلاسفہ کے تین نظریات کو عقل و نقل دونوں کی روشنی میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور ان نظریات کے حاملین کی تکفیر کی۔ یہ نظریات درج ذیل ہیں:

۱) قیامت کے دن اجسام نہیں بلکہ صرف ارواح اٹھائی جائیں گی۔

۲) خدا کو جزئیات کا نہیں بلکہ صرف کلیات کا علم حاصل ہے۔

۳) یہ کارخانۂ عالم ازل سے ابد تک قائم رہے گا۔

تقریباً اسی دور میں امام ابن تیمیہؒ نے بھی لگ بھگ اسی موضوع پر ایک کتاب ''الرد علی المنطقیین'' کے نام سے لکھی۔ تاہم وہ اتنی اثر پذیری حاصل نہ کر سکی جو کہ امام غزالیؒ کی ''تہافۃ الفلاسفہ'' کو حاصل ہوئی اور نہ ہی وہ علمی حلقوں میں اتنی مقبولیت حاصل کر سکی جتنی کہ اتنی بڑی علمی شخصیت کی کتاب کو ملنی چاہئے تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کتاب امام ابن تیمیہؒ کے دیگر علمی کارناموں میں دب کر رہ گئی ہو اور پھر یہ بھی کہ وہ دور جس میں یہ کتاب لکھی گئی انتشار و بدامنی کا دور تھا۔

ابن طفیل اور ابن رشد

امام غزالیؒ کے اس گراں قدر کام کے بعد مسلمانوں بالخصوص عربوں میں فلسفیانہ

افکار ایک عرصے تک سر نہ اٹھا سکے اور فلسفہ ستر اسّی سال تک اپنے زخم سہلاتا رہا' یہاں تک کہ دو اندلسی فلاسفہ ابن طفیل اور ابن رشد جو آپس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی رکھتے تھے (ابن طفیل استاد اور ابن رشد شاگرد تھا) نے اسے سہارا دیا۔ یہ دونوں بھی اپنے ہم عصروں کی طرح فلاسفہ ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس دان بھی تھے' کیونکہ اس وقت تک سائنس اور فلسفے میں ثنویت قائم ہی نہ ہوئی تھی۔ بہرحال ابن طفیل نے بہت سی کتابیں لکھیں' تاہم آج تک صرف ایک ہی کتاب محفوظ رہ سکی ہے اور وہی عالمگیر شہرت کی حامل ہے۔ اس کا نام ہے ''حی ابن یقظان''۔ یہ ایک تمثیلی داستان ہے جس کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان وحی کے بغیر بھی عقل و منطق اور وجدان کے ذریعے حقیقت مطلقہ کو پا سکتا ہے' اور اس طرح اس نے فلسفے کو کھڑا ہونے کے لئے زمین فراہم کی۔ پھر اس کے شاگرد ابن رشد نے اس کے کام کو مزید آگے بڑھایا۔ ابن طفیل تو عقل و منطق کے ساتھ ساتھ وجدان اور مذہبی تجربے کا بھی قائل تھا لیکن ابن رشد صرف اور صرف عقل و منطق کا قائل تھا۔ بہرحال ابن رشد کی اصل حیثیت تو ارسطو اور اس کی منطق کے مترجم اور شارح سے زائد نہیں ہے' تاہم اس کی اصل وجہ شہرت اس کی کتاب ''تہافۃ التہافۃ'' (ردّ کا ردّ) ہے جس میں اس نے امام غزالیؒ کی کتاب ''تہافۃ الفلاسفہ'' کا فلاسفہ کی جانب سے جواب دیا ہے۔ اس میں اس نے مسلمانوں میں فلسفے کی اہمیت کو پھر سے اجاگر کرنے اور امام غزالیؒ کے الزامات کا ردّ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوا یہ ایک الگ بحث ہے' تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے اس ضمن میں مسلم فلاسفہ کا اعتماد ایک بار پھر بحال ضرور کیا۔

اس نے یوں تو اس کتاب میں ان تمام بیس باتوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جنہیں امام غزالیؒ نے اٹھایا ہے' تاہم اس نے خصوصی طور پر ان تین مسائل پر زور دیا ہے جن کی بنا پر امام غزالیؒ نے ابن سینا' فارابی اور دیگر کی تکفیر کی تھی۔ اس نے کہا کہ بے شک اللہ کائنات کے ایک ایک ذرے سے واقف ہے لیکن اس کا اندازِ علم ہم

سے مختلف ہے۔ اسی طرح کائنات کی ازلی حیثیت کے بارے میں اس نے کہا کہ کائنات بہرحال ثانوی حیثیت کی حامل ہے تاہم خدا کا کائنات پر تقدم منطقی طور پر ہے نہ کہ زمانی یا تاریخی طور پر۔ چونکہ زمان و مکان کا اطلاق صرف اس کائنات پر ہی ہوتا ہے اور خدا زمان و مکان کی وسعتوں سے بالاتر ہے لہٰذا یہ سوال مکمل طور پر غیر منطقی ہے کہ خدا سے پہلے کیا تھا؟ یا خدا کائنات سے پہلے تھا؟ مزید برآں حشر اجساد کے متعلق اس نے کہا کہ قرآن کی تاویل وتفسیر ایک خاص انداز سے کرنا بہرحال کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی بنا پر کسی کو کافر قرار دیا جا سکے۔

بغداد اور غرناطہ کے اجڑنے کے بعد مسلمانوں میں فکر کے سوتے بڑی حد تک خشک ہو گئے اور علم وفن کی وہ اہمیت پھر قائم نہ ہو سکی جو پہلے تھی' یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ کے قیام کے بعد بھی توجہات دوسری اطراف میں ہی مرتکز رہیں۔ (جاری ہے)

مرکزی انجمن خدام القرآن کے شعبہ سمع و بصر کی تیار کردہ

دینی موضوعات کی ویڈیو سی ڈیز (VCD's)

☆ختم نبوتؐ اور تکمیل رسالتؐ	2 ویڈیو سی ڈیز
☆عظمت مصطفیٰ ﷺ	2 ویڈیو سی ڈیز
☆شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں ایک اصلاحی قدم	ایک ویڈیو سی ڈی
☆متاع الغرور (دنیا.....دھوکے کا سامان)	ایک ویڈیو سی ڈی
☆قائداعظم اور علامہ اقبال کا نظریہ پاکستان	2 ویڈیو سی ڈیز
☆منتخب نصاب (جاری)	51 ویڈیو سی ڈیز
☆بیان القرآن (قرآن پاک کا مکمل ترجمہ و مختصر تشریح)	108 ویڈیو سی ڈیز

قیمت فی VCD: 40 روپے

ملنے کا پتہ: قرآن اکیڈمی' 36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 03-5869501